ڈاکٹر عبادت بریلوی

شبلی کی تنقید

شبلی اردو کے ممتاز نقاد ہیں۔ انھوں نے اردو میں تنقید کی داغ بیل ڈالی۔ ان کے ساتھ آزاد اور حالی بھی اس سلسلے میں پیش پیش رہے اور اردو میں تنقید کے علم برداروں کی حیثیت سے ان کا مرتبہ بھی اپنی اپنی جگہ مسلّم ہے۔ شبلی کی تنقید کا انداز ان دونوں نقادوں سے مختلف ہے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ وہ اپنی ایک مخصوص انفرادیت رکھتی ہے اور اس نے اردو تنقید کو ایک نئے انداز سے آشنا کیا ہے۔ آزاد کے پاس ایک اسلوب تھا۔ ان کی تنقید اسی اسلوب کے سہارے آگے بڑھتی ہے۔ اس میں سارا کھیل اندازِ نگارش کا ہے۔ ان کے فقرے بڑے پُرلطف ہوتے ہیں اور ان کی بدولت بعض تنقیدی حقائق کی نقاب کشائی ہوتی ہے۔ لیکن ان کا مزاج تجزیاتی نہیں ہے، اسی لیے ان کی تنقید میں بھی تجزیاتی انداز نہیں ملتا۔ حالی ایک تجزیاتی مزاج رکھتے تھے، اسی لیے ان کی تنقید میں بڑا ذہن ملتا ہے۔ وہ موضوع کے کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑتے۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دیتے ہیں۔ ان کی تنقید معاملہ فہمی کی بہت اچھی مثال ہے۔ اس میں بڑی بصیرت کا احساس ہوتا ہے لیکن حالی کی تنقید میں اسلوب اور اندازِ نگارش کا حسن نسبتاً کم ہے۔ وہ حکیمانہ ہے، اس میں اسلوب کی دل کشی نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ حالی کی تنقید تمام تر حقائق کی تلاش اور ان کے تجزیے سے عبارت ہے۔ اسی لیے اس میں بصیرت کا حسن تو ہے لیکن وہ بذاتِ خود حسین نہیں ہے۔ شبلی کی تنقید میں اس کا اسلوب تو ملتا ہے لیکن وہ صرف اسلوب تک محدود نہیں ہے۔ وہ حالی کی تنقید کی طرح تجزیاتی بھی نہیں ہے۔ لیکن اس میں بصیرت کا حُسن اور حسن کی بصیرت کا امتزاج ملتا ہے، اور یہی اس کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ شبلی نرے نقاد نہیں ہیں۔ ان کی شخصیت میں شاعری کا رنگ بھی رچا ہوا ہے۔ اسی لیے اس میں وہ دل کشی نظر آتی ہے جس کا ہیولا جذبے اور تخیل کے باہمی امتزاج سے تیار ہوتا ہے۔ شبلی جذبے کے پرستار اور تخیل کے علمبردار ہیں۔ اس صورتِ حال نے انھیں رومانی مزاج بنا دیا ہے۔ ان کی اس

رومانیت سے تنقید بھی متاثر ہوئی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ ان کے یہاں جگہ جگہ رومانی نقاد ہیں اور اردو تنقید کو رومانی رنگ و آہنگ سے آشنا کرنے کا سہرا انھیں کے سر ہے۔

اردو ادب میں شبلی کی کئی حیثیتیں ہیں وہ بیک وقت ایک عالم، ایک مورخ، ایک سوانح نگار، ایک ماہر زبان و لسان، ایک شاعر اور ایک نقاد تھے۔ غرض ان کی شخصیت خاصی پہلو دار، متنوع وسیع اور ہمہ گیر تھی اور اس کے اثرات ان کی تنقید میں بھی نظر آتے ہیں۔ وہ عالمانہ ہے۔ اس میں ایک تاریخی شعور بھی ملتا ہے۔ انفرادی اور اجتماعی نفسیات کی جھلکیاں بھی اس میں موجود ہیں۔ اس میں زبان و لسان کے مختلف پہلوؤں کی طرف توجہ بھی نظر آتی ہے، اور اس میں ایک شاعرانہ زاویۂ نظر بھی اپنی جھلکیاں دکھاتا ہے۔ انھیں اثرات کی بدولت ان کی تنقید بھی خاصی پہلو دار، وسیع اور ہمہ گیر بن گئی ہے۔ اس جلوے میں مختلف علوم انسانی کا جلوۂ صد رنگ نظر آتا ہے شبلی فلسفی نہیں تھے اس لیے اس میں فلسفیانہ مزاج تو نہیں ملتا، البتہ مختلف علوم کے سہارے زندگی کے حقائق کی تلاش و جستجو ان کے مزاج کی بنیادی خصوصیت تھی۔ چنانچہ یہ خصوصیت ان کی تنقید میں بھی نمایاں ہے۔ تنقید نقاد کے مزاج اور افتادِ طبع کا عکس ہوتی ہے۔ شبلی کی تنقید بھی ان کے مزاج اور افتادِ طبع کا عکس ہے۔ وہ ان کے مزاج، علم، اور جذبے کا مرکب ہے۔ اسی لیے ان سب کا متوازن امتزاج ان کی تنقید میں بھی نمایاں ہے۔ اس میں علمیت ہے۔ گہرا تاریخی اور معاشرتی شعور ہے۔ وہ ایک تہذیبی روایت کے پس منظر میں ابھرتی ہے۔ اس میں انسانی زندگی کے جذباتی نظام کا بڑا دخل نظر آتا ہے اور زندگی کے ذوقی اور جمالیاتی پہلوؤں کا خیال اس میں ابھرا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ غرض وہ خاصی وسیع اور ہمہ گیر ہے اور نقاد کی حیثیت سے شبلی کی انفرادیت کو نمایاں کرتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ شبلی گہرا تنقیدی شعور رکھتے تھے۔ اس تنقیدی شعور کو ان کے مخصوص انفرادی اور اجتماعی حالات نے پیدا کیا تھا۔ انھیں زندگی سے دلچسپی تھی۔ انھوں نے اس کو قریب سے دیکھا تھا۔ وہ زندگی کو بسر کرنے اور برتنے کی خواہش رکھتے تھے۔ ان کی طبیعت میں انعزالیت نہیں تھی۔ وہ زندگی سے بیزار نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کے کسی پہلو کو انھوں نے نظر انداز نہیں کیا۔ ان کے یہاں زندگی کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے اور ان کے نشیب و فراز کو جاننے کی خواہش تھی۔ انھوں نے مختلف علوم کو حاصل کرنے میں خاصے انہماک کا اظہار کیا تھا اور ان میں سے بیشتر میں مہارت

حاصل کی تھی۔ وہ دین کے بہت بڑے عالم تھے اور دین کے اجتماعی پہلو کو انھوں نے بخوبی سمجھا تھا۔ انھیں تاریخ اور تہذیب سے دلچسپی تھی اور وہ اس کے مد و جزر سے پوری طرح واقفیت رکھتے تھے۔ انھیں ادب و شعر سے خاص لگاؤ تھا اور ان کی اصلیت اور حقیقت ان پر روشن تھی۔ عربی اور فارسی ادبیات کا انھوں نے خاص طور پر مطالعہ کیا تھا اور وہ ان کی روح سے آشنا تھے۔ مغربی ادبیات سے بھی وہ ناواقف نہیں تھے۔ انگریزی اور فرانسیسی سے انھوں نے دلچسپی لی تھی۔ ان حالات نے ان کے تنقیدی شعور پر جلا کی اور ادب و شعر کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے کا خیال ان کے یہاں پیدا ہوا۔ اس کے علاوہ اس زمانے کے حالات نے شبلی کے شعور کی نشو و نما میں خاصہ حصہ لیا ہے۔ ان کا زمانہ ہندوستانی مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں نشاۃ الثانیہ کا زمانہ ہے۔ اس زمانے میں مسلمانوں کو سرسید کی قیادت نصیب ہوئی اور انھوں نے ان کو دینی، علمی، تعلیمی، معاشرتی اور تہذیبی اعتبار سے ایک نئی زندگی سے ہم کنار کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ مسلمانوں نے اپنے آپ کو بدلا۔ اس میں اس تنقیدی شعور کا بڑا ہاتھ ہے جو سرسید کی تحریک نے اس زمانے کے مسلمانوں میں عام کیا۔ شبلی اس ماحول سے متاثر تھے۔ سرسید سے انھوں نے اختلاف بھی کیا ہے، کیونکہ وہ انگریزوں کے بہت بڑے مخالف تھے۔ لیکن اس کے باوجود سرسید کی تحریک نے مسلمانوں کی زندگی میں جس نشاۃ الثانیہ کی داغ بیل ڈالی تھی، اس کا شبلی پر اثر تھا۔ مغربی تہذیب کے زیر اثر جو خیالات عام ہو رہے تھے ان سے شبلی کو بظاہر کوئی تعلق نہیں تھا لیکن جو فضا ان خیالات نے قائم کی تھی اس سے شبلی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ غرض ان تمام حالات نے شبلی کو ایک درجہ کے تنقیدی شعور سے آشنا کیا۔ ان کی تنقید اسی شعور کی پیداوار ہے اور اس تنقیدی شعور کے مختلف محرکات کی جھلک ان کی تنقید میں بھی نظر آتی ہے۔

شبلی کی تنقید کے نظری اور عملی دونوں پہلوؤں کی طرف توجہ کی ہے۔ ان کا خاص میدان شاعری کی تنقید ہے۔ انھوں نے شاعری کے اصولوں پر بھی بحث کی ہے۔ اصناف سخن کے اصول بھی وضع کیے ہیں اور شاعروں پر عملی تنقید بھی کی ہے۔ اس لحاظ سے ان کی تصنیف شعر العجم خصوصیت کے ساتھ اہمیت رکھتی ہے۔ شعر العجم کی پانچ جلدیں ہیں۔ ان میں چوتھی جلد نظریاتی اور اصولی تنقید سے متعلق ہے اور اس میں شاعری کے مختلف پہلوؤں پر بصیرت افروز تنقیدی بحث اور اصناف سخن کا تنقیدی تجزیہ ہے۔ بقیہ جلدوں میں مختلف فارسی شعرا اور فارسی شاعری کے مختلف

رجحانات کا تنقیدی جائزہ ہے۔ غرض اس کتاب میں نظری اور عملی تنقید کے بہت اچھے نمونے موجود ہیں اور اس کو سامنے رکھا جائے تو شبلی کے اندازِ تنقید کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے۔ شعر العجم کے علاوہ تنقیدی اعتبار سے ان کی ایک اور اہم تصنیف موازنۂ انیس و دبیر ہے۔ اس میں مرثیہ نگاری کے فن پر اصولی بحث ہے، اور ساتھ ہی انیس و دبیر کے مرثیوں کا تقابلی مطالعہ ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے انیس کے کلام کو خاص طور پر اپنے پیش نظر رکھا ہے اور اس کی مختلف خصوصیات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس بحث کا انداز اگرچہ تشریحی اور توضیحی زیادہ ہے لیکن اس میں جگہ جگہ اعلیٰ درجہ کی تنقید بھی ملتی ہے۔ ایک اور اہم بات اس کتاب میں یہ ہے کہ اس میں شبلی نے فصاحت و بلاغت اور اس کے مختلف پہلوؤں پر اصولی اور نظریاتی بحث بھی کی ہے۔ اس بحث میں بھی ان کا تنقیدی شعور کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ بہرحال یہ کتاب بھی تنقیدی اعتبار سے اہمیت رکھتی ہے۔

شعر العجم کی چوتھی جلد میں شبلی نے اصول شعر کو واضح کیا ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر تنقیدی زاویۂ نظر سے روشنی ڈالی ہے۔ اس سے ان کے نظریاتِ تنقید کا پوری طرح اندازہ ہوتا ہے، اور شاعری کی حقیقت اور ماہیت کے بارے میں جو خیالات و نظریات پیش کیے ہیں ان کی روشنی میں انھوں نے فارسی شاعری کی تاریخ اور تمدن کا جائزہ بھی لیا ہے، اور اس کے مختلف پہلوؤں پر تنقیدی بحث بھی کی ہے۔ شاعری کو وہ ذوقی اور وجدانی چیز سمجھتے ہیں۔ اسی لیے ان کے خیال میں شاعری کی جامع اور مانع تعریف نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ مختلف طریقوں سے مثالیں دے کر اس کی حقیقت کو واضح کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں، "شاعری چونکہ ذوقی اور وجدانی چیز ہے اس لیے اس کی جامع تعریف چند الفاظ میں نہیں کی جا سکتی۔ اس بنا پر مختلف طریقوں سے اس کی حقیقت کا سمجھانا زیادہ مفید ہوگا کہ ان سب کے مجموعے سے شاعری کا صحیح نقشہ پیش نظر ہو جائے۔" چنانچہ انھوں نے مختلف مثالیں دے کر شاعری کی اہمیت واضح کی ہے۔ ان کے نزدیک شاعری کا منبع ادراک نہیں بلکہ احساس ہے۔ احساس سوچنے اور غور کرنے کا نام نہیں۔ وہ اس سے ایک مختلف قوت ہے جو ہر انسان میں پائی جاتی ہے۔ انسان متاثر ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مختلف واقعات اس پر اثر کرتے ہیں، اور اس طرح اس پر مختلف کیفیات طاری ہوتی ہیں۔ شبلی

لکھتے ہیں کہ: "جب اسے کوئی مؤثر واقعہ پیش آتا ہے تو وہ متاثر ہو جاتا ہے۔ غم کی حالت میں صدمہ ہوتا ہے۔ خوشی میں سرور ہوتا ہے۔ حیرت انگیز بات پر تعجب ہوتا ہے۔ یہی قوت جس کو احساس، انفعال یا فیلنگ سے تعبیر کر سکتے ہیں، شاعری کا دوسرا نام ہے۔ یعنی یہی احساس جب الفاظ کا جامہ پہن لیتا ہے تو شعر بن جاتا ہے۔" اور ان کا یہ خیال صحیح ہے۔ کیونکہ احساس کے بغیر شاعری کوئی معنی نہیں رکھتی۔ یہ احساس جب شدید ہوتا ہے تو فطری اور اضطراری طور پر انسان کی زبان سے موزوں الفاظ نکلتے ہیں۔ اسی کا نام شعر ہے۔ اس میں شاعر کی شعوری کوشش کو دخل نہیں ہوتا ہے۔ یہ کم و بیش ایک ایسی کیفیت ہے جو شیر کو گرجنے، ہاتھی کو چنگھاڑنے، کوئل کو کوکنے، مور کو ناچنے اور سانپ کو لہرانے پر مجبور کرتی ہے۔ انسان چونکہ حیوانِ ناطق ہے اس لیے اپنی کیفیات کو الفاظ کے سانچے میں ڈھال دیتا ہے۔ اس بحث کے بعد شبلی اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ، "جو جذبات الفاظ کے ذریعہ سے ادا ہوں وہ شعر ہیں، اور چونکہ یہ الفاظ سامعین کے جذبات پر بھی اثر کرتے ہیں یعنی سننے والوں پر بھی وہی اثر طاری ہوتا ہے جو صاحبِ جذبہ کے دل پر طاری ہوتا ہے، اس لیے شعر کی تعریف یوں بھی کر سکتے ہیں کہ جو کلام انسانی جذبات کو برانگیختہ کرے اور ان کو تحریک میں لائے وہ شعر ہے۔" اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شبلی شاعری میں جذبات کی اہمیت کے قائل ہیں۔ جذبات کے بغیر شاعری کا وجود نہیں ہوتا۔ وہ جذبات سے پیدا ہوتی ہے اور اس کا کام جذبات میں تحریک پیدا کرنا اور ان کو ابھارنا ہے۔ لیکن اس کا مطلب ہیجان اور ہنگامہ پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ جذبات میں زندگی اور جولانی کا پیدا کرنا ہے۔

شبلی کے خیال میں تمام عالم ایک شعر ہے۔ زندگی میں شاعری بکھری پڑی ہے۔ جہاں زندگی ہے وہاں شاعری موجود ہے، اور جہاں شاعری ہے وہاں زندگی موجود ہے۔ ایک یورپین مصنف کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں کہ "ہر چیز جو دل پر استعجاب یا حیرت یا جوش یا اور کسی قسم کا اثر پیدا کرتی ہے شعر ہے۔ اس بنا پر فلکِ نیلگوں، نجمِ درخشاں، نسیمِ سحر، گلگونۂ شفق، تبسمِ گل، خرامِ صبا، نالۂ بلبل، ویرانیٔ دشت، شادابیٔ چمن، غرض تمام عالم شعر ہے۔" گویا ساری زندگی میں یہ شعریت پائی جاتی ہے مناظر بھی اپنے دامن میں شعریت رکھتے ہیں اور جس طرح ان کا اثر ہوتا ہے، شاعری بھی اسی طرح انسان کے دل پر اپنا اثر کرتی ہے۔ یوں اور چیزیں بھی دل کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

مثلاً موسیقی، مصوری، صنعت گری وغیرہ۔ لیکن شاعری کی اثر انگیزی کی حد سب سے زیادہ وسیع ہے۔ موسیقی صرف قوتِ سامعہ کو محظوظ کر سکتی ہے۔ سامعہ نہ ہو تو وہ کچھ کام نہیں کر سکتی۔ تصویر سے متاثر ہونے کے لیے بینائی شرط ہے۔ لیکن شاعری تمام حواس پر اثر ڈال سکتی ہے۔ باصرہ، ذائقہ، شامہ، لامسہ سب اس سے لطف اٹھاتے ہیں۔ فرض کرو شراب آنکھوں کے سامنے نہیں ہے اس لیے آنکھ اس سے حظ نہیں اٹھا سکتی۔ لیکن جب ایک شاعر اس کو آتشِ سیال سے تعبیر کرتا ہے تو ان الفاظ سے ایک موثر منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اس طرح جب بوسے کو شاعرانہ انداز میں تنگ شکر کہہ دیتے ہیں تو کام و دہن کو مزہ محسوس ہوتا ہے۔" اس سے صاف ظاہر ہے کہ شبلی کے نزدیک شاعری تمام فنونِ لطیفہ میں بلند اور برتر حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا تعلق حواس سے ہے اور بیک وقت انسان کے تمام حواس کو متاثر کرنا اس کا بنیادی مقصد ہے۔ اسی لیے انسانی زندگی میں اس کا اتنا عمل دخل نظر آتا ہے اور وہ دوسرے فنونِ لطیفہ کے مقابلے میں اس سے نسبتاً زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ وہ انھیں زیادہ لطف دیتی ہے اور وہ اس سے زیادہ لطف حاصل کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ ایک سرخوشی بن کر حواس پر چھا جاتی ہے۔

شاعری کا تعلق جذبات سے ہے۔ وہ انسانی جذبات میں ایک ارتعاش سا پیدا کرتی ہے اور انھیں تحریک میں لاتی ہے۔ اس کو پڑھ کر یا سن کر رنج، خوشی یا جوش کا اثر پیدا ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ سائنس اور دوسرے علوم و فنون سے ممتاز ہے۔ شاعری کا تعلق جذبات سے ہے اور سائنس کا یقین سے۔ سائنس استدلال سے کام لیتا ہے اور شاعری محرکات کو استعمال کرتی ہے۔ سائنس عقل کے سامنے کوئی علمی مسئلہ پیش کرتا ہے لیکن شاعری احساسات کو دل کش مناظر دکھاتی ہے۔ کیونکہ اس کی نوعیت تمام تر داخلی ہے۔ اس میں دل کی باتیں ہوتی ہیں۔ شاعر اندرونی جذبات اور احساسات کی نیرنگیوں کا ماہر بلکہ تجربہ کار ہوتا ہے۔ یہ بات مورخ اور خطیب میں نہیں ہوتی۔ اسی لیے شاعری تاریخ اور خطابت سے اتنی مختلف نظر آتی ہے۔ تاریخ میں واقعات کی صداقت کو پیش کیا جاتا ہے۔ خطابت کا مقصد لوگوں سے خطاب کرنا اور انھیں کسی بات پر اکسانا ہوتا ہے۔ لیکن شاعری ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں رکھتی۔ وہ تو صرف جذبات کی ترجمانی کرتی ہے۔ دل میں احساسات کی جو لہریں اٹھتی ہیں انھیں الفاظ کے سانچے میں ڈھال دینا شاعری کا مقصد ہے۔ اس سلسلے میں

شبلی نے صاف صاف لکھا ہے کہ "اصلی شاعری وہی ہے جس کو سامعین سے کچھ غرض نہ ہو۔" اس کا مطلب یہی ہے کہ شاعر عوام کو سامنے رکھ کر شاعری نہیں کرتا۔ اس کی مخصوص کیفیات اسے شعر کی تخلیق کے لیے مجبور کرتی ہیں۔ وہ شبلی کے خیال میں تنہا نشینی اور مطالعہ نفس کا نتیجہ ہے۔ اور شبلی کے ان خیالات میں بڑی صداقت پائی جاتی ہے۔ شاعری کا اثر تو عوام پر ہوتا ہے۔ وہ اس سے اثر بھی قبول کرتے ہیں۔ لیکن شاعر اس لیے شاعری نہیں کرتا کہ وہ عوام پر اثر کرے اور وہ اس سے اثر قبول کریں۔ اس کے پیشِ نظر تو اپنی داخلی کیفیات کا جمالیاتی اظہار ہوتا ہے، اور یہی شاعری کی اصل روح ہے۔

اس جمالیاتی اظہار کے مختلف عناصر ہیں۔ ان عناصر ہی سے شاعری کی تشکیل ہوتی ہے۔ شبلی نے لکھا ہے کہ "ایک عمدہ شعر میں بہت سی باتیں پائی جاتی ہیں۔ اس میں وزن ہوتا ہے۔ محاکات ہوتی ہے۔ یعنی کسی چیز یا کسی حالت کی تصویر کھینچی جاتی ہے۔ خیال بندی ہوتی ہے۔ الفاظ سادہ ہوتے ہیں۔ بندش صاف ہوتی ہے۔ طرزِ ادا میں جدت ہوتی ہے۔" لیکن "حقیقت یہ ہے کہ شاعری دراصل دو چیزوں کا نام ہے محاکات اور تخیل۔ ان میں سے ایک بات بھی پائی جائے تو شعر، شعر کہلانے کا مستحق ہوگا۔ باقی اور اوصاف یعنی سلاست، صفائی، حسن بندش وغیرہ وغیرہ شعر کے اجزائے اصلی نہیں بلکہ عوارض اور مستحسنات ہیں۔" اس سے صاف ظاہر ہے کہ شبلی کی نظر شعر و شاعری کے بنیادی عناصر تک پہنچتی ہے، اور وہ فروعی باتوں کے بجائے انھیں بنیادی عناصر کو اہمیت دیتے ہیں۔

محاکات کی تعریف کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے "محاکات کے معنی کسی چیز یا کسی حالت کا اس طرح ادا کرنا ہے کہ اس شے کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے۔" لیکن تصویر اور محاکات میں فرق ہے۔ ان کے خیال میں تصویر کا اصل کمال یہ ہے کہ اصل کے مطابق ہو اور اگر مصور اس امر میں کامیاب ہو گیا تو اس کو کامل فن کا خطاب مل سکتا ہے۔ لیکن شاعر کو اکثر موقعوں پر دو مشکل مرحلوں کا سامنا ہوتا ہے۔ یعنی نہ اصل کی پوری تصویر کھینچ سکتا ہے کیونکہ بعض جگہ اس قسم کی پوری مطابقت احساسات کو برانگیختہ نہیں کر سکتی۔ نہ اصل سے زیادہ دور ہو سکتا ہے ورنہ اس پر اعتراض ہوگا کہ صحیح تصویر نہیں کھینچی۔ اس موقع پر اس کو تخیل سے کام لینا پڑتا ہے۔ وہ ایسی تصویر کھینچتا ہے جو اصل سے آب و تاب اور حسن و جمال میں بڑھ جاتی ہے، لیکن وہ قوتِ تخیل سے سامعین پر یہ اثر ڈالتا ہے کہ یہ وہی چیز ہے۔ لوگوں نے اس کو امعانِ نظر سے نہیں دیکھا تھا اس لیے اس کا حسن پوری

طرح نمایاں نہیں ہوتا۔" غرض شاعر مصور سے زیادہ کمال رکھتا ہے۔ وہ اپنے تخیل کی مدد سے ایسی تصویروں کی تخلیق کرتا ہے جو اصل سے زیادہ حقیقت سے بھرپور اور خوبصورت ہوتی ہیں۔ یہی محاکات ہے اور جب شاعری میں یہ صورتِ حال پیدا ہوتی ہے تو محاکات شباب پر پہنچ جاتی ہے "اعلیٰ شاعری کا یہی مقصد ہے کہ وہ حقیقت کی ترجمانی کرے اور اس ترجمانی میں محاکات اپنے شباب پر نظر آئے۔"

شبلی نے اس سلسلے میں تخیل پر بھی بہت اچھی بحث کی ہے۔ ان کے خیال میں "تخیل دراصل قوتِ اختراع کا نام ہے۔ عام لوگوں کے نزدیک منطق اور فلسفے کا موجد صاحبِ تخیل نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ اگر خود کسی فلسفہ دان کو اس لقب سے خطاب کیا جائے تو اس کو عار نہیں آئے گا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہی قوتِ تخیل ہے جو ایک طرف فلسفہ میں ایجاد اور اکتشافِ مسائل کا کام دیتی ہے اور دوسری طرف شاعری میں شاعرانہ مضامین پیدا کرتی ہے۔" ظاہر ہے کہ یہ تخیل کا وہی تصور ہے جو بڑے بڑے نقادوں نے پیش کیا ہے۔ اس بات پر وہ سب کے سب متفق ہیں کہ تخیل انسان کی ایک عجیب و غریب صلاحیت ہے جو زندگی اور اس کے حقائق کو سمجھنے میں معاون ہوتی ہے۔ اسی لیے شاعری میں یہ قوت حقائق کو واضح کرتی ہے۔ یہی شاعری کے موضوعات اور مضامین ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ ان حقائق کو جمالیاتی انداز میں پیش کرتا ہے۔ تاکہ اس کا خاطر خواہ اثر ہو۔ اسی کو شبلی نے جذباتِ انسانی کی تحریک سے تعبیر کیا ہے۔ یہ تحریک فلسفہ اور سائنس سے نہیں ہوتی۔ وہ تو صرف کسی علمی مسئلے کو حل کر دیتے ہیں۔ اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے " فلسفہ اور سائنس میں قوتِ تخیل کا استعمال اس غرض سے ہوتا ہے کہ ایک علمی مسئلے کو حل کر دیا جائے۔ لیکن شاعری میں تخیل سے کام لیا جاتا ہے کہ جذباتِ انسانی کو تحریک ہو۔ فلسفی کو صرف ان موجودات سے غرض ہے جو واقع میں موجود ہیں، بخلاف اس کے شاعر ان موجودات سے بھی کام لیتا ہے جو مطلق موجود نہیں۔ فلسفے کے دربار میں ہما، سیمرغ، کاؤ زمین، تختِ سلیمان کی مطلق قدر نہیں لیکن یہی چیزیں ایوانِ شاعری کے نقش و نگار ہیں۔ فلسفی کی زبان سے اگر سیمرغ زریں پر کا لفظ نکل جائے تو ہر طرف سے ثبوت کا مطالبہ ہوگا۔ لیکن شاعر اس قسم کی فرضی مخلوقات سے اپنا عالمِ خیال آباد کرتا ہے اور کوئی اس سے ثبوت کا طالب نہیں ہوتا۔ کیونکہ فلاسفر کی طرح وہ کسی مسئلہ کی تعلیم کا

دعویٰ نہیں کرتا۔ بلکہ وہ ہم کو صرف خوش کرنا چاہتا ہے اور بے شبہ وہ اس میں کامیاب ہوتا ہے۔"
غرض اس طرح فلسفے اور سائنس کو سامنے رکھ کر شبلی نے تخیل پر بہت اچھی بحث کی ہے اور اس طرح شاعری میں اس کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ اس بحث سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ تخیل شاعری کا ایک اہم عنصر ہے۔ اس کے بغیر شاعری کو شاعری کی صورت اختیار کرنا نصیب نہیں ہوتا۔ تخیل ہی کی بدولت شاعری وہ ایک مخصوص صورت اختیار کرتی ہے جس میں تاثر کا سحر ہوتا ہے۔ یہی اس کی سب سے بڑی خوبی ہے اگر اس میں تاثر کا سحر نہ ہو تو وہ بے مقصد اور بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔

اس تخیل اور محاکات کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ تخیل کے بغیر محاکات کا وجود نہیں ہو سکتا۔ لیکن شبلی کے یہاں یہ محاکات درحقیقت ایک جمالیاتی اظہار ہے جس میں تاثر کا یہ سحر پایا جاتا ہے۔ اس لیے محاکات کے تحت وہ ان تمام باتوں کو شامل کرتے ہیں جن میں سے شاعری کی تشکیل ہوتی ہے اور جن کی بدولت اس میں تاثیر کا یہ سحر پیدا ہوتا ہے۔ شبلی کے خیال میں محاکات کی تکمیل کئی چیزوں سے ہوتی ہے۔ اس میں سب سے پہلے شعر کا وزن اور آہنگ ہے۔ شاعرانہ خیال بذاتِ خود اپنا ایک وزن اور آہنگ رکھتا ہے اور اس کے جمالیاتی اظہار کو بھی اسی وزن و آہنگ کے ساتھ مناسبت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معنی اور خیال کا عکس صورت اور فن میں جھلکتا ہے۔ شبلی لکھتے ہیں: "محاکات جب موزوں کلام کے ذریعہ سے کی جائے تو سب سے پہلے وزن کا تناسب شرط ہے کہ درد، غم، رنج، جوش، غضب ہر ایک کے اظہار کا لہجہ اور آواز مختلف ہے اس لیے جس جذبہ کی محاکات مقصود ہو، شعر کا وزن بھی اس کے مناسب ہونا چاہیے تاکہ اس جذبے کی پوری حالت ادا ہو سکے۔ دوسری چیز جو محاکات کے اثر کو دوبالا کرتی ہے ایسی باتوں کی ترجمانی ہے جو بذاتِ خود لطیف اور دل آویز ہوں تاکہ ان کا اثر گہرا اور ہمہ گیر ہو۔ تیسری چیز الفاظ کا موضوع کی مناسبت کے ساتھ استعمال ہے تاکہ جس چیز کی محاکاتی تصویر پیش کی جائے وہ زیادہ اجاگر ہو کر موثر بن جائے۔ چوتھی چیز طرزِ ادا اور لہجے کا خیال ضروری ہے تاکہ جس ماحول کی تصویر کھینچی جا رہی ہے وہ اصل سے قریب ہو، اور خاطر خواہ اثر کر سکے۔"

محاکات یا جمالیاتی اظہار کے لیے کائنات کی ہر چیز کا بغور مطالعہ بھی ضروری ہے کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو شاعر غلط باتیں کر سکتا ہے۔ شبلی نے لکھا ہے "محاکات کے کمال کے لیے عالمِ کائنات

کی ہر قسم کی چیزوں کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ شاعر کبھی لڑائیوں اور معرکوں کا حال لکھتا ہے۔ کبھی قوموں کے اخلاق و عادات کی تصویر کھینچتا ہے۔ کبھی جذباتِ انسانی کا عالم دکھاتا ہے۔ کبھی شاہی دربار کا جاہ و حشم بیان کرتا ہے۔ کبھی ٹوٹے پھوٹے جھونپڑوں کی سیر کراتا ہے۔ اس عالم میں اگر اس نے عالمِ کائنات کا مطالعہ نہ کیا اور ایک ایک چیز کی خصوصیات اور قابلِ انتخاب باتوں کو دقتِ آفرینی سے نہ دیکھا تو وہ ان مرحلوں کو کیونکر طے کر سکتا ہے۔" اسی لیے انھوں نے جزئیات کے مطالعے تک پر زور دیا ہے۔ شاعر اس جزئیات کو مختلف طریقوں سے پیش کرتا ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ ایک ایک چیز کی تفصیل بیان کرے۔ اشاروں اور کنایوں میں وہ ایسی باتیں کہہ جاتا ہے جن سے تفصیلِ جزئیات آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ لیکن یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک جزئیات پر اس کی نظر نہ ہو۔ اگر جزئیات پر اس کی نظر ہوتی ہے تو وہ اس کے بیان پر قدرت رکھتا ہے اور کبھی اشاروں کنایوں میں، کبھی مخالف اور متضاد پہلوؤں کو ابھار کر، کبھی تشبیہ اور استعارے کے ذریعہ کبھی مبہم طریقے سے وہ کچھ ایسی صورتیں پیدا کرتا ہے کہ جو کچھ اس نے دیکھا اور محسوس کیا ہے اس کی ہو بہو تصویر سامنے آجاتی ہے۔ اس تصویر میں تخیل کا رنگ بہت گہرا ہوتا ہے۔ اسی سے اس میں جان پیدا ہوتی ہے، کیونکہ محاکات کا کام تو بیان کرنا ہے۔ اس بیان میں ترتیب اور تناسب کو تخیل ہی پیدا کرتا ہے اور اسی ترتیب اور مناسبت میں شاعری کا حسن ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ حسن تخیل کا مرہونِ منت ہے۔

شعر و شاعری کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے شبلی نے تشبیہ و استعارہ پر بھی بڑی خیال انگیز بحث کی ہے۔ ان کے خیال میں "یہ چیزیں شاعری بلکہ عام زبان آوری کے خط و خال ہیں جن کے بغیر انشا پردازی کا جمال قائم نہیں رہ سکتا۔ ایک عامی سے عامی بھی جب ہوش یا غیظ و غضب سے لبریز ہو جاتا ہے تو جو کچھ اس کی زبان سے نکلتا ہے، استعارات کا قالب بن کر نکلتا ہے۔ غم و رنج کی حالت میں انشا پردازی اور تکلف کا کس کو خیال ہو سکتا ہے، لیکن اس حالت میں بھی بے اختیار استعارات زبان سے ادا ہوتے ہیں۔" اس کا مطلب یہی ہے کہ استعارے کا وجود فطری طور پر ہوتا ہے اور شاعری میں اس کو شاعر کی وہ ذہنی کیفیت پیدا کرتی ہے جس سے وہ شاعری کرتے وقت دوچار ہوتا ہے۔ اس میں اس کی شعوری کوشش شامل نہیں ہوتی۔ تشبیہ و استعارہ کا حسن ان کی جدت اور ندرت میں ہے اور اس کا انحصار تمام تر شاعرانہ خیال کی جدت اور ندرت پر ہے۔ یہ جدت اور ندرت اس

جدت اور اپج کی پیداوار ہے جو شاعری کے لیے ضروری ہے۔ اسی کو ایک نیا اسلوب اور نیا انداز کہتے ہیں۔ نئے اسلوب اور نئے انداز کے بغیر شاعری میں دل کشی پیدا نہیں ہو سکتی۔

اس انداز اور اسلوب کی تشکیل و تعمیر میں الفاظ بڑا کام کرتے ہیں۔ کیونکہ الفاظ کا حسن ہی شاعری کو دل کش بناتا ہے۔ حسنِ الفاظ کے بغیر اچھی اور دل کش شاعری کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ شبلی نے اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے سب سے پہلے ابن رشیق کی کتاب العمدہ کے باب فی اللفظ والمعنی کا خلاصہ پیش کیا ہے۔ اس باب کا بنیادی خیال یہ ہے کہ لفظ جسم ہے اور مضمون روح۔ ان دونوں میں جسم اور روح کا تعلق ہے۔ اگر ایک میں کمزوری ہوتی ہے تو دوسرا بھی کمزور معلوم ہوتا ہے۔ اس مثال سے یہ بات واضح ہے کہ موضوع اور لفظ آپس میں ایک دوسرے کے ہم آہنگ ہیں۔ لیکن اہلِ فن میں سے بعض لفظ کو مضمون پر اور بعض مضمون کو لفظ پر ترجیح دیتے ہیں۔ شبلی نے خود اس سلسلے میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ "شاعری یا انشا پردازی کا مدار زیادہ تر الفاظ ہی پر ہے۔ گلستان میں جو مضامین اور خیالات ہیں، ایسے اچھوتے اور نادر نہیں لیکن الفاظ کی فصاحت اور ترتیب و تناسب نے ان میں سحر پیدا کر دیا ہے۔ انھیں مضامین اور خیالات کو معمولی الفاظ میں ادا کیا جائے تو سارا اثر جاتا رہے گا۔" لیکن آگے چل کر یہ بھی لکھا ہے کہ "اس تقریر کا یہ مطلب نہیں کہ شاعر کو صرف الفاظ سے غرض رکھنی چاہیے اور معنی سے بالکل بے پروا ہو جانا چاہیے۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ مضمون کتنا ہی بلند اور نازک ہو لیکن اگر الفاظ مناسب نہیں ہیں تو شعر میں کچھ تاثیر پیدا نہ ہو سکے گی۔" اس سے صاف ظاہر ہے کہ شبلی موضوع اور الفاظ دونوں کو اہمیت دیتے ہیں، لیکن ان دونوں کی مناسبت اور ہم آہنگی ان کے نزدیک ضروری ہے۔ مثلاً ان کے خیال میں محبت کے نازک اور لطیف خیالات و جذبات صرف نازک اور لطیف الفاظ ہی میں صحیح طور پر ادا ہو سکتے ہیں۔ ان کے لیے پُرشوکت اور بلند الفاظ کا استعمال مناسب نہیں۔ شاعر اس کا شعور رکھتا ہے۔ اسی لیے اس کے لطیف جذبات لطیف الفاظ کے سانچے میں ڈھلتے ہیں۔ غزل کے لیے قصیدے کے الفاظ اور قصیدے کے لیے غزل کے الفاظ استعمال نہیں کیے جا سکتے۔ کیونکہ اس طرح مطلب تو شاید ادا ہو جائے لیکن شاعری میں متاثر کرنے اور دلوں میں جگہ بنانے کی صلاحیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر سب سے پہلے ان باتوں کا خیال رکھتا ہے۔ الفاظ کی صوتی اہمیت اس پر واضح ہوتی

ہے۔ معنی کے لحاظ سے الفاظ جو اثر کرتے ہیں وہ اس کا شعور رکھتا ہے۔ فصیح اور مانوس الفاظ کے استعمال پر اسے قدرت حاصل ہوتی ہے اور وہ اس کی اہمیت کو سمجھتا ہے۔ اس سلسلے میں اسے کوئی بڑی کاوش نہیں کرنی پڑتی۔ بلکہ ان باتوں کا جز بن جاتا ہے اور اسے سادگی ادا اور جدت ادا سے کام لینے اور شعر کے مختلف اجزا کو ترتیب دینے میں کوئی خاص دشواری پیش نہیں آتی۔

شبلی نے اس کے علاوہ شاعری میں واقعیت اور مبالغے کے موضوع پر بھی بعض بڑی ہی بصیرت افروز باتیں کی ہیں۔ پہلے تو انھوں نے اس اختلاف کا ذکر کیا ہے جو واقعیت اور مبالغے کے علم برداروں میں ہے، اور پھر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ "شعر کی دو قسمیں ہیں، تخیلی اور غیر تخیلی۔ تخیلی میں واقعہ سے غرض نہیں ہوتی بلکہ زیادہ تر یہ مطمح نظر ہوتا ہے کہ قوت تخیل کس قدر پُرزور اور وسیع ہے۔ اس بنا پر اس قسم کی شاعری میں مبالغے سے کام لیا جائے تو بدنما نہیں۔ لیکن وہاں بھی سامعین کی طبیعت پر استعجاب کا جو اثر پیدا ہوتا ہے وہ مبالغے کی وجہ سے نہیں بلکہ قوت تخیل کی بنا پر ہوتا ہے لیکن اور اقسام شاعری مثلاً فلسفیانہ، اخلاقی، تاریخی، عشقیہ، پنچرل ان میں مبالغہ بالکل لغو چیز ہے اس لیے اگر شعر میں مبالغہ جائز بھی ہو تو صرف شعر کی ایک خاص نوع (تخیل) میں ہوگا۔ اس سے عام خوبی نہیں ثابت ہو سکتی۔" اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ شبلی شاعری میں اصلیت اور واقعیت کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ کیونکہ زندگی اور خصوصاً داخلی اور جذباتی زندگی کی اصلیت اور واقعیت سے بھرپور ترجمانی ہی اس کا مقصد ہے۔ لکھتے ہیں "شاعری سے اگر صرف تفریح خاطر مقصود ہو تو مبالغہ کام آسکتا ہے۔ لیکن وہ شاعری جو ایک طاقت ہے، جو قوموں کو زیر و زبر کر سکتی ہے، جو ملک میں ہلچل ڈال سکتی ہے، جس سے عرب قبائل میں آگ لگا دیتے تھے، جس سے نوحہ کے وقت در و دیوار سے آنسو نکل پڑتے تھے، وہ واقعیت ہے۔ شعرائے جاہلیت کے کلام میں واقعیت ہوتی تھی۔ اس لیے اس کا واقعی اثر ہوتا تھا، اور ایرانی شعرا باتوں کے طوطا مینا بناتے تھے جس سے دم بھر کی تفریح ہو سکتی تھی باقی ہیچ۔" اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ باتوں کے طوطا مینا بنانا شاعری کا مقصد نہیں ہے۔ وہ صرف خیالی باتیں نہیں کرتی۔ اس میں محض مبالغہ ہی نہیں ہوتا وہ تو حقیقت و واقعیت کی ترجمانی کرتی ہے۔ اس کا مقصد تو اصلیت کو پیش کرنا ہوتا ہے۔ وہ قوموں کو زیر و زبر کر سکتی ہے۔ ملکوں میں ہلچل ڈال سکتی ہے اور اس طرح اس کے ہاتھوں زندگی میں ایک انقلاب

برپا ہو سکتا ہے۔

غرض شاعری ایک موثر چیز ہے۔ وہ دلوں کو لبھاتی ہے اور حواس پر چھا جاتی ہے۔ اس کے اثرات کے نقوش دل و دماغ پر بڑے گہرے ہوتے ہیں۔ اس کے مؤثر ہونے کے اسباب بھی شبلی نے واضح کیے ہیں۔ ارسطو نے اپنی کتاب میں نقالی کا جو نظریہ پیش کیا ہے اس کی وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ "ارسطو نے جو وجوہ بیان کیے ہیں گو بجائے خود صحیح ہیں لیکن شعر کی تاثیر ان ہی باتوں (یعنی نقل اور موسیقیت) پر موقوف نہیں جن کی وجہ سے وہ دلوں کو متاثر کرتا ہے۔" اور پھر آگے چل کر اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ "شاعری کو جذبات ہی سے تعلق ہے اس لیے تاثیر اس کا عنصر ہے۔ شاعری ہر قسم کے جذبات کو برانگیختہ کرتی ہے۔ اس لیے رنج، خوشی، جوش، استعجاب اور حیرت میں جو اثر ہے، شعر میں بھی وہی اثر ہوتا ہے۔ مصورانہ شاعری اس لیے دل پر اثر کرتی ہے کہ جو مناظر اثر انگیز ہیں شاعری ان کو پیش نظر کر دیتی ہے۔ بادِ سحر کے جھونکے، آبِ رواں کی رفتار، پھولوں کی شگفتگی، غنچوں کا تبسم، سبزے کی لہلہاہٹ، خوشبوؤں کی لپیٹ، بادل کی پھوار، بجلی کی چمک، یہ منظر آنکھوں کے سامنے ہو، دل پر وجد کی کیفیت طاری ہو جائے گی۔ شاعری ان مناظر کو پیش نظر کر دیتی ہے اس لیے اس کی تاثیر سے کیونکر انکار ہو سکتا ہے۔ شاعری صرف محسوسات کی تصویر نہیں کھینچتی بلکہ جذبات اور احساسات کو بھی پیش نظر کر دیتی ہے۔ اکثر ہم خود اپنے نازک اور پوشیدہ جذبات سے واقف نہیں ہوتے یا ہوتے ہیں تو صرف ایک دھندلا دھندلا سا نقش نظر آتا ہے۔ شاعری ان پس پردہ چیزوں کو پیش نظر کر دیتی ہے۔ دھندلی چیزیں چمک اٹھتی ہیں۔ مٹا ہوا نقش اجاگر ہو جاتا ہے۔ کھوئی ہوئی چیز ہاتھ آجاتی ہے۔ خود ہماری روحانی تصویر جو کسی آئینے کے ذریعے سے ہم نہیں دیکھ سکتے شعر ہم کو دکھا دیتا ہے۔ ان چند جملوں میں شبلی نے شعر کی تاثیر کے موضوع پر بڑی ہی پتے کی باتیں کہی ہیں۔ شاعری میں جذبات کی اہمیت مسلّم ہے۔ انسانی زندگی میں جذبات کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ شاعری ان جذبات کی ترجمانی کرتی ہے۔ انھیں جذبات سے اس کا ہیولیٰ تیار ہوتا ہے۔ انسان کی جذباتی زندگی سیدھی اور سپاٹ نہیں ہوتی۔ وہ تہہ در تہہ ہوتی ہے۔ صرف شاعری ہی زندگی کی اس کیفیت کو پیش کر سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو کچھ

انسان کے دل میں ہوتا ہے اس کی جھلک اسے شاعری میں نظر آتی ہے۔ چنانچہ وہ اس سے متاثر ہوتا ہے۔ ساتھ ہی وہ اس کے ذوقِ جمال کی تسکین کا باعث بھی بنتی ہے۔ اسی میں اس کے موثر ہونے کا راز ہے۔

شاعری چونکہ موثر ہوتی ہے اس لیے شبلی نے اسے ایک قوت بتایا ہے۔ ان کے خیال میں اس قوت سے بڑے بڑے کام لیے جاسکتے ہیں، بشرطیکہ اس کا استعمال صحیح طور سے کیا جائے۔ اس سے زندگی بسر کرنے کی خواہش بیدار ہوسکتی ہے۔ اقدارِ خیر کے فروغ کے لیے افراد کو اکسایا جاسکتا ہے۔ شریفانہ اخلاق پیدا کیا جاسکتا ہے۔ فلسفیانہ حقائق ذہن نشین کیے جاسکتے ہیں۔ غرض شاعری زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کرتی ہے اور اس کا اثر بہت گہرا اور دیرپا ہوتا ہے۔ اسی لیے اس کی عظمت ہر زمانے میں محسوس کی گئی ہے۔

یہ تنقیدی نظریات ہیں جو شبلی نے شعر العجم میں پیش کیے ہیں اور ان میں سے ہر ایک پر بڑی بصیرت افروز اور خیال انگیز بحث کی ہے۔ اس بحث میں ایک متوازی انداز اور ایک مربوط کیفیت ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے جو بات کہی ہے وہ مدلل ہے۔ اس میں شروع سے آخر تک ایک منطقی انداز بھی پایا جاتا ہے۔ ان خیالات کی وضاحت انھوں نے عربی اور فارسی شاعری کی مثالوں سے کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی یہ بحث مشکل، خشک اور بے مزہ نہیں ہے۔ اس سے شعر و شاعری کے بعض پیچیدہ مسائل کی گتھیاں سلجھتی ہیں اور پڑھنے والے کو روشنی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے ان خیالات و نظریات میں وسیع مطالعے کا بڑا ہاتھ ہے۔ عربی اور فارسی کی تنقید کو انھوں نے اس سلسلے میں خاص طور پر اپنے پیش نظر رکھا ہے۔ عربی کے توسط سے وہ یونانی تنقید سے بھی آشنا ہوئے ہیں اور یونانی تنقید کے اثرات بھی ان خیالات و نظریات میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ کہیں کہیں مغربی اثرات کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن ان اثرات کے باوجود شبلی کی انفرادیت ان میں ہر جگہ نمایاں ہے۔ یہ ان کی شخصیت اور مزاج کی پیداوار ہے۔ اس میں ان کے زمانے کی بدلتی ہوئی صورتِ حال کا بڑا ہاتھ ہے جذباتی زندگی کا احساس اور عمرانی حالات کا شعور ان میں ہر جگہ موجود ہے اور ان میں جو گہرائی اور گیرائی پائی جاتی ہے وہ اسی احساس و شعور کا نتیجہ ہے۔

نظریاتی اور اصولی تنقید کے ساتھ ساتھ شبلی کے یہاں عملی تنقید کے بھی بہت اچھے نمونے ملتے ہیں۔ اس لحاظ سے شعرالعجم ان کی ایک اہم کتاب ہے۔ اس کتاب میں جہاں انھوں نے مختلف شعرا کا تذکرہ کیا ہے وہاں ان کے کلام کی خصوصیات بھی واضح کی ہیں۔ ان تحریروں سے ان کی عملی تنقید کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ کسی تنقیدی خیال کا اظہار کرتے ہوئے وہ ان اصولوں کا ضرور خیال رکھتے ہیں جن کو انھوں نے شاعری کے لیے ضروری قرار دیا ہے۔ مثال کے طور پر ان کے نزدیک شاعری زمانے کا ساتھ دیتی ہے۔ اسی لیے اس میں نئے نئے مضامین پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ شاعروں کے تذکرے میں ان کی نظر انھیں نئے مضامین کی جستجو کرتی ہے۔ رودکی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس نے "کثرت سے نئے نئے مضامین پیدا کیے ہیں۔" شاعری کی واقعیت ان کے نزدیک ضروری ہے۔ چنانچہ رودکی ہی کے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ "اس میں متانت اور واقعیت پائی جاتی ہے۔" اسی طرح فرخی کے بارے میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ "اس نے واقعہ نگاری کو بہت ترقی دی۔" ان کے خیال میں شاعری کی ضروری شرط اسلوب، بیان کی جدت اور دل آویزی ہے۔ سنائی کے کلام میں انھیں یہ خصوصیت نہیں ملتی۔ چنانچہ لکھتے ہیں "ترکیب اور قصائد میں انھوں نے کوئی جدت نہیں پیدا کی لیکن پختگی، برجستگی اور صفائی میں ان کا کلام تمام معاصرین سے ممتاز ہے۔" شعرالعجم کی جلدیں اس قسم کے تنقیدی فقروں سے بھری پڑی ہیں۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ان کی یہ عملی تنقید تجزیاتی نہیں ہے اس میں تشریحی پہلو غالب نظر آتا ہے۔ لیکن اس تشریح میں شبلی کی نظر اس تنقیدی حقیقت تک پہنچ جاتی ہے جو کسی شاعر کے کلام میں موجود ہے۔ عملی تنقید سے یہی شبلی کا مقصد ہے۔ ظاہر ہے کہ شعرالعجم بنیادی طور پر ایک تنقیدی کتاب نہیں ہے۔ وہ تو فارسی شاعری کی تاریخ ہے۔ اگر وہ خالص تنقیدی کتاب ہوتی تو تنقیدی پہلو اس میں نسبتاً زیادہ نمایاں ہوتا۔ پھر بھی جو کچھ انھوں نے فارسی شاعری کی اصناف اور فارسی کے مختلف شعرا کے بارے میں لکھا ہے اس میں تنقیدی اعتبار سے بصیرت افروز باتیں ہیں۔ کہیں کہیں ان میں تاثراتی رنگ بھی پایا جاتا ہے لیکن اس سے ان کی تنقیدی اہمیت میں فرق نہیں آتا۔ بلکہ ان کے یہ اشارے اور تاثراتی فقرے تنقیدی اعتبار سے

زیادہ بصیرت افروز اور خیال انگیز نظر آتے ہیں۔

غرض شبلی کی تنقیدی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اردو تنقیدی روایت میں ان کی تنقید نگاری اپنا ممتاز مقام رکھتی ہے۔ انھوں نے اس زمانے میں تنقید کی طرف توجہ کی جب اس میں تنقید کی روایت عام نہیں تھی۔ ان کا زمانہ تنقیدی اعتبار سے اہم زمانہ ہے۔ حالی اور آزاد نے اس زمانے میں تنقید کا جو ماحول پیدا کیا ہے، شبلی کی تنقیدی تحریریں بھی اس میں برابر کی شریک رہی ہیں۔ انھوں نے نظریاتی اور عملی دونوں اعتبار سے اردو تنقید میں اضافہ کیا ہے۔ ان کی تنقید تجزیاتی نہیں ہے اسی لیے اس میں گہرائی کم ہے۔ لیکن تشریحی اور تاثراتی انداز میں انھوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان میں تنقید کا ایک ایسا نیا اسلوب پایا جاتا ہے جس سے اردو تنقید اب تک نا آشنا تھی۔

مسلمانوں کے عقائد و افکار

علامہ ابوالحسن اشعری — ترجمہ مولانا محمد حنیف ندوی

یہ کتاب چوتھی صدی ہجری کے جلیل القدر عالم علامہ ابوالحسن اشعری کے شاہکار مقالات الاسلامیین کا ترجمہ ہے۔ اس میں علامہ نے چوتھی صدی ہجری کے اوائل کے ان تمام عقائد و افکار کو بغیر کسی تعصب کے بیان کر دیا ہے جو صدیوں ہمارے ہاں فکری و کلامی مناظروں کا محور بنے رہے۔ اس کے مطالعے سے جہاں یہ معلوم ہوگا کہ مسلمانوں نے نفسیات، اخلاق، اور مادہ و روح کے بارے میں کن کن علمی جواہر پاروں کی تخلیق کی ہے وہاں یہ حقیقت بھی نکھر کر سامنے آجائے گی کہ ماضی میں فکر و نظر کی کجی نے کن کن گمراہیوں کو جنم دیا ہے اور ان گمراہیوں کے مقابلے میں اسلام نے کس معجزانہ انداز سے اپنے وجود کو برقرار رکھا ہے۔ قیمت ۹ روپے

ملنے کا پتہ

سیکریٹری ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور